بلوچستان کے پشتو افسانے پر عالمی اردو افسانے کے اثرات کا مختصر جائزہ

effects of Urdu afsana on Pashto fiction in Balochistan, A critical review

زرمینہ کاکڑ*

Abstract:

If we look closely at the objective, tribal life of Balochistan, folk stories have been presented here long before fiction writing. Those instructive stories that our elderly men and women used to tell in the long winter nights, they were really long legends, a blessing of folk literature. That we are benefiting from modern literature in an intellectual age, the main and important element in fiction is the story. In our folk tales, every aspect of life was described in a very prominent way. After partition, the people who migrated from United India came to Pakistan and settled in different areas, among them a large number of Urdu speaking people settled in different areas of Balochistan. In this research article, the impact of global Urdu fiction on Pashto fiction of the Balochistan has been briefly reviewed.

Key words: modern literature, folk stories, short stories, global Urdu fiction, Pashto fiction.

بلوچستان کے معروضی، قبائلی زندگی کو قریب سے دیکھا جائے، تو یہاں پر افسانہ نگاری سے بہت پہلے لوک کہانیاں افسانوی انداز میں پیش کی جاتی رہی ہیں۔ وہ سبق آموز کہانیاں جو سردیوں کی طویل راتوں میں ہمارے بزرگ مرد و خواتین سنایا کرتے تھے وہ دراصل طویل افسانے تھے لوک ادب کا احسان ہے کہ ہم ایک فکری دور میں جدید ادب سے مستفید ہو رہے ہیں افسانہ میں بنیادی اور اہم عنصر کہانی ہی تو ہے ہماری لوک کہانیوں میں زندگی کا ہر پہلو بہت نمایاں انداز میں بیان ہو رہا تھا بہادری کے قصے ‘مہمان نوازی اور پناہ دینے کے قصے ‘بدلہ لینا‘ اور دوشمن سے نبرد آزما ہونے کے قصے ‘سخاوت اور دریادلی کے قصے‘ مہر وفا کے قصے الغرض رومانوی قصوں سے دیومالائی قصوں تک ہر موضوع پر ہمارا لوک ادب بہترین سرمایہ رکھتی ہے جب ہمسایہ ملک ہندوستان سے اہل زبان (اردو بولنے والے) حضرات یہاں آئے تو اپنے ساتھ اردو فکشن بھی ساتھ لائےٍ یوں اردو کی ترقی اور ادب میں افسانہ نویسی کی ارتقاء دراصل متحدہ ہندوستان کے زمانے میں نمایاں مقام حاصل کر چکی تھی آکا دکا افسانہ نگار یہاں بھی پیدا ہو چکے تھے جیسے محمد عمر

* M.Phil Scoler, Department of Urdu, University of Balochistan Quetta

بلوچ،یوسف عزیز مگسی اور ناصر بلوچستان کا حوالہ قابل ذکر ہے اس عہد سے تقسیم ہند تک اردو افسانہ یہاں کے تمام زبانوں کے افسانوی ادب پر اثر انداز ہو تا رہا ہے۔

تقسیم کے بعد جو لوگ متحدہ ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آئے اور مختلف علاقوں میں آباد ہوئے ان میں ایک کثیر تعداد اردو اہل قلم کی یہاں بلوچستان کے مختلف علاقوں میں آباد ہوئے یوں بھی اس لیے پہلے انگریزی دور حکومت میں بھی ریلوے کا نظام یہاں پر متعارف ہوا اور انگریز فوج کو افغان بارڈر تک رسائی کیلے چمن تک ریلوے لائن بچھائی تھی تاکہ روسی توسیع پسند کو روکا جاسکے تو یہاں انگریز فوج اور ریلوے کے نظام میں کام کرنے والے بہت سارے غیر بلوچستانی اردو بولنے والے یہاں آکر مستقل آباد ہوئے وہ اپنے ساتھ وہاں کے ادبی ورثہ لئے ہوئے تھے جس میں افسانہ بہت اہمیت رکھتا ہے جس نے پشتو افسانوں پر بے پناہ اثرات مرتب کئے افغان ثور انقلاب کے زمانے میں جب روسی ادب کا اردو اور پھر پشتو میں ترجمہ ہونے لگا تو اس پر اس 666 میں روسی مارکیٹ ادب جو دولت کے تقاء کے صزف تھا پہلے اردو میں ترجمہ ہوا اور پھر سوشلنٹ روس کے معاشی نظام کے اثرات بھی پشتو افسانے پر پڑھنے لگے مشہور روس زمانہ افسانہ 5555 انسان کو کتنی زمین کی ضرورت ہے پہلے روسی زبان سے انگریزی اور پھر دنیا کے مختلف زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو میں ترجمہ ہوا جس نے یہاں کے جاگیر داری نظام کو ہلا کر رکھ دیا پشتو میں اس علمی افسانے نے بھی بے پنا اثرات چھوڑے۔

پشتو ادب میں جنس پر لکھنا نسبتاً مشکل کام تھا اور ہے لیکن علمی اردو افسانوی ادب خاص کر منٹو کرشن چند بیدی اور عصمت چغتائی جسے قلمکاروں کے بے لاگ طرز تجربہ یرنے پشتو افسانے پر بھی بے پناہ اثرات مرتب کئے جس کے زیر اثر پشتون قلمکار نے بھی نہایت ۸۹۸ انداز میں افسانوی نمونے چھوڑے یہ علمی اردو ادب ہی تھا جس نے تخلیق سے تراجم تک ہر میدان میں خطے کے دیگر زبانوں کے افسانوی ادب کو متاثر کیا معشت سے معاشرت تک رومان سے جنس پرستی تک الغرض کوئی شعبہ حیات ایسا نہیں کہ اردو ادب اور عالمی اردو ادب، جو زیادہ تر ہندوستان کے اردو لکھنے والوں کا مرہون منت ہے، پشتو افسانے پر گہرے اثرات مرتب کئے۔

عالمی اردو افسانے کے اثرات ہی تھے کہ پہلی بار یہاں کے بااثر طبقے اور ان کے کردار کے منفی پہلو زیر بحث آئے، خواتین کرداروں کی معاشرتی زندگی کو دقیق مطالعے کے بعد ان کی نفسیاتی مسائل کو افسانوں کا موضوع بنایا گیا، خود غرضی اور لالچ کے پیکر یہاں کے تاجر طبقے کو نشانہ بنایا، مظلوم اور کمزوروں

کی آواز تحریروں میں شامل ہوئی، معاشی ناہمواریوں کو مخاطب کیا گیا، اپنے اقدار کی پاسداری اور فرسودہ رسوم سے بغاوت کا درس بھی ان افسانوں کا مرکزی خیال بنا، یہ سب کچھ دراصل اردو عالمی ادب جو تراجم سے تخلیق تک سبھی کے اثرات ہیں، بلوچستان کے پشتو افسانے پر نمایاں نظر آتے ہیں۔

عالمی اردو افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوی صنف میں اپنے ماحول، مسائل، ثقافت اور لوگوں کے عادات واطوار اور رویوں کو اس خوبصورتی سے سمویا ہے کہ مغربی تکنیکوں اور تحریکوں کی بدتری کے باوجود اس صنف سے رشتہ بھرپور دکھائی دیتا ہے، پشتو کے بیشتر محققین اس بات پر متفق ہے کہ افسانہ پشتو میں اردو کے راستے سے داخل ہوا، اور یہ بات بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ جس طرح پشتو ادب میں افسانے کی شروعات اردو افسانے سے ہوئی اسی طرح یہ بات بھی پھر تسلیم کرنی پڑے گی، کہ اس نے اثرات بھی پشتو افسانے پر مرتب کئے ہونگے، بلکل اسی طرح جیسے اردو کے ابتدائی افسانے یعنی پریم چند کے دور اول کے افسانے اصلاحی مقاصد کی پرچار کرتے ہیں، اور اسی طرح پشتو افسانہ اصلاحی مقاصد کی تبلیغ کرتے ہوئے معاشرے سے فرسودہ رسوم اور معاشرتی خرابیوں کی اصلاح کرنے کو ترجیح دیتا ہے۔ ابو الخیر زلاند کا افسانہ ''ولورمات سو'' جو بلوچستان میں پشتو ادب میں لکھا جانے والا پہلا افسانہ ہے، اس افسانے پر پریم چند کے افسانے ''مجبوری'' اور ''بیوہ'' کے اثرات نمایان نظر آتے ہیں، کیونکہ پریم چند نے اپنے ابتدائی افسانوں میں اپنے معاشرے میں عورت ذات پر ہونے والے مظالم کو اپنے افسانوں کے ذریعے اجاگر کیا اور اسی طرح ابو الخیر زلاند نے بھی ''ولورمات سو'' میں عورت پر اس ظلم کی نشاندہی کی ہے، جو ''ولور'' کے لالچ میں اس کے ارمانوں اور خواہشات کا قتل کر کے اسے بوڑھوں مردوں کے حوالے کر دیتے ہیں، جس کا آخر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یا تو یہی لڑکیاں اپنی زندگیوں کی قربانی دے دیتے ہیں، یا پھر ساری عمر اسی گزارتی ہے کہ نہ تو خود خوش رہتی ہے، اور نہ پھر دوسروں کو خوش رہنے دیتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ آج تک کوئی بھی اپنے آپ کو پریم چند کے افسانوں کے سحر سے آزاد کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا، تقریباً ہر زبان کے لکھنے والوں نے سب سے پہلے اپنے افسانوں کے موضوعات پریم چند کے افسانوں سے متاثر ہو کر ان کا طرز بیان اپنایا، ان کے لب ولہجے میں افسانوں کی ابتدا کی، اور اسی طرح پشتو ادیبوں نے بھی پریم چند کے افسانوں سے متاثر ہو کر ان کے طرز میں افسانے تخلیق کئے، جو آج تک پشتو کے بہترین افسانوں میں شمار ہوتے ہیں، اسی طرح بلوچستان میں پشتو ادب میں لکھے جانے والے افسانوں میں نمایاں اثرات پریم چند کے افسانوں کے دیکھنے کو ملتے ہیں، یعنی پشتو افسانے چاہئے وہ بلوچستان

کے ہو یا افغانستان کے ہر دور پر پریم چند کے افسانوں کے اثرات مرتب ہوتے رہے۔ معاشرتی کہانیوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے اصلاحی افسانے بھی لکھے، جس کے اثر کے تحت بلوچستان کے پشتو افسانہ نگاروں نے پشتو میں اصلاحی انداز کے افسانے لکھے۔

پریم چند کا افسانہ ''کفن'' جن کا شمار صرف ان کے شاہکار افسانوں میں نہیں ہوتا ہے بلکہ اردو ادب کے شائد افسانوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کے افسانے نے افسانوی دنیا میں ایک ہلچل مچا دیا۔ اور دنیا میں جتنی بھی زبانیں بولی جاتی ہے ان زبانوں کے افسانوی ادب پر ''کفن'' کے اثرات ہمیں نمایاں نظر آتے ہیں، اور بلوچستان کے پشتون ادیب بھی اس افسانے کے اثر سے خود کو بچا نہ سکے، کیونکہ پریم چند نے اپنے اس افسانے کے ذریعے برصغیر کے لوگوں کی غربت کا اور اس سماج اور معاشی نظام پر بھرپور طنز کیا گیا ہے اور ساتھ میں یہ بھی دکھایا ہے کہ غربت کچھ اور کیا انسانی فطرت کو بھی فتح کر کے مسخ کر دیتی ہے، اور انسان کو اتنا بے حس بنا دیتی ہے کہ انسان حیوان کی سطح سے بھی نیچے چلا جاتا ہے، پریم چند کا یہ افسانہ اپنے زمانے میں ہی نہیں آج بھی ''تہلکہ خیز'' سمجھا جاتا ہے اور اسے اردو کے ترقی پسند ادب میں غربت کے سماجی و نفسیاتی اثرات پر ایک بڑی تخلیقی دستاویز کی حیثیت حاصل ہے، طاہر اقبال لکھتی ہیں:

"پریم چند کا اسلوب ان کے فن کی طرح مختلف ارتقائی و تدریجی مراحل سے گزرتا رہا، جو ان کے آخری دور میں تکمیل پایا، جس کا ظہور ''کفن'' جیسے فن پارے میں ہوا، لیکن ان کے لفظ لفظ سے فن کار کا خلوص اور دردمندی جھلکتی ہے، جیسے لفظ نہ ہوں، درد کی گرھیں ہوں جو بندھتی اور کھلتی چلی جارہوں''(۱)۔

بلکل اسی طرح بلوچستان کے پشتون ادیبوں نے بھی غربت اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل کی نشاندہی اپنے افسانوں کے ذریعے کی ہیں اور ان ادیبوں نے پریم چند کی طرح اپنے افسانوں کے ذریعے اپنے سماج کے منہ پر طمانچہ رسید کیا ہے، اس سلسلے میں لکھے جانے والے افسانوں میں تاجک طالب کا افسانہ ''سحر تہ لاڈیر وخت ستہ'' مقدس خان معصوم کا ''د او شکو قیمت''، خلیل باور کا ''د خپل سر سوداگر'' نظر پانیزئی کا ''ثبوت'' پروسیجر'' ماشومہ'' اور ''دا سوک دہ؟'' در محمد کاسی کا ''وچی او شکی'' اور بارکوال میاخیل کا افسانہ ''نیستی و ہستی'' اور ''غربت'' قابل ذکر افسانے ہیں، جس نے پریم چند کی طرح اپنے معاشرے میں غربت و افلاس جیسی معاشرتی مسائل کے تحت لوگوں کا غلط سمت میں چلنا اور اس دلدل

سے نکلنے کیلئے غلط طریقے اپنانا، ان موضوع پر مشتمل یہ افسانے ہیں، اور افسانوں میں افسانہ نگاروں نے خاص طور پر غریب اور نادار لوگوں کی بے بسی بیان کی ہے اور یہ دکھایا گیاہے، کہ کس طرح امیر لوگ اپنے ماتحتوں کولاچار دیکھ کر ان کی بے بسی کا مذاق اڑاتے ہیں، جس کی وجہ سے یہی غریب لوگ غلط کاموں کا راستہ انتخاب کرتے ہیں، اور اپنے بے بسی اور لاچاری کو جرائم کے پردے میں چھپاکر خواہشات پورے کرنے کی خواہش رکھتے ہیں، ایسے میں بے بسی اور مفلس لوگوں کے نظر میں جائز اور ناجائز کی کوئی تمیز نہیں رہتی۔ بلوچستان میں پشتو ادب کے یہ افسانے معاشرتی اقدار کو پائمال کرنے کی بہترین کہانیاں ہیں، جن پر نفسیاتی رجحان بھی غالب ہے، جس میں غربت اور بے بسی کو بڑے پُر درد انداز میں سامنے لایا گیا ہے، اور ساتھ ساتھ ان افسانوں پر اصلاحی رجحان غالب ہے، اور اپنے معاشرے میں موجود ایسے کرداروں کے ساتھ ہمدردی اور محبت کی تاکید کر رہاہے، نظرپانیزئی کا افسانہ ”داخوک دہ؟“ میں بھیک مانگنے والی عورت، خلیل باور کا افسانہ ”د خپل سر سوداگر“ میں اختر محمد، در محمد کاسی کا افسانہ ”وچی او شکی“ میں ساحرہ اور پریم چند کے افسانہ ”کفن“ کا مادھو اور گھیسو اس سماج کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ ان افسانہ نگاروں نے اپنے ان افسانوں کے ان کرداروں کے ذریعے رسید کیاہیں، پریم چند کے اثرات ان افسانوں پر صرف موضوع کے حوالے سے نہیں بلکہ کرداروں کے حوالے سے بھی نمایاں ہیں، افسانہ ”کفن“ کے حوالے سے پروفیسر سید وقار عظیم لکھتے ہیں:

پریم چند نے ”کفن“ میں ایک مخصوص معاشرے، ایک مخصوص معاشی اور سیاسی نظام اور اس نے معاشرے اور معاشی نظام میں پیدا ہونے اور پرورش پانے والے دو انسانوں کی زندگی کے خارجی اور داخلی کوائف بیان کئے ہیں، اس میں مشاہدہ فکر اور تخیل کی تیزی، گہرائی اور وسعت نے مل جل کر پوری طرح ہم آہنگہو کر اپنا کام پورا کیا۔۔۔ پریم چند کا افسانہ ”کفن“ ہمارے افسانے کی زندگی میں ایک سنگ میل ہے“(2)۔

پریم چند کے افسانوں کے موضوعات میں اتنا تنوع ہے اور حقیقت کے اتنے قریب ہیں کہ پشتو کے افسانہ نگاروں کے علاوہ بلوچستان کے اردو افسانہ نگاروںنے بھی اپنے اپنے طرز اسلوب میں ان موضوعات پر شاہکار افسانے تخلیق کیے۔ پریم چند کے بعد اردو افسانے میں دوسرا اہم نام سجاد حیدر یلدرم کا آتاہے، جن کا شمار اردو افسانہ نگاروں کے رومانوی میلانات کے معماروں میں ہوتاہے، ایک اچھے افسانہ نگار کے ساتھ ساتھ کامیاب مترجم بھی تھے، ان کے ہاں رومانوی عنصر ترکی ادب کے افسانوں سے آیا،

انہوں نے انگریزی، عربی اور ترکی افسانوں کے ترجمے کے ذریعے اردو افسانے کو نئی سمت عطا کی۔ سید سلمان ندوی کے الفاظ میں:

''وہ ہماری زبان میں ایک نئی صنف ادب کے بانی تھے، اس لئے ہماری ادبی تاریخ میں ان کا ایک پایہ ہے''(3)

یلدرم کا پیش نظر مسئلہ یہ تھا کہ افسانے کیلئے کوئی ایسا موضوع تلاش کیا جائے، جو دلچسپ بھی ہو اور زندگی سے اس کا گہرا تعلق بھی ہو، اس مقصد کے پیش نظر اور مزاج کی مناسبت سے یلدرم نے محبت، عورت اور اس کے مسائل کو افسانے کا موضوع بنایا، انہوں نے اپنے افسانوں میں عورت اور محبت کے موضوع پر بڑی رغبت اور بڑی کثرت سے اظہار خیال کیا ہے، اور اپنے افسانوں میں عورت اور مرد کے تعلقات ہیں اور عورت کو اس کا فطری حق دلانے کیلئے ایسے فنی وسیلوں اور حربوں سے کام لیا ہے، کہ نہ ان کے مقصد ہی پر حرف آیا، اور نہ خود ان پر معاشرتی اقدار اور اخلاقی قواعد و قیود توڑنے کا الزام عائد ہو سکا۔ اس موضوع پر لکھے جانے والے افسانے ''خارستان و گلستان'' ازدواج محبت'' سودائے سنگین'' اور حکایہ لیلیٰ و مجنون'' قابل ذکر افسانے ہیں، جس میں انہوں نے عورت کو نسائیت، شعریت اور لطافت کا ایک مکمل مجسمہ بنا کر پیش کیا ہے، اور عشق کو حاصل زندگی اور خوش مذاقی کا آئینہ قرار دیا ہے، ان کا عشق صوفیانہ نہیں، نہ وہ میر کی یاس نصیبی کے قائل ہیں، اور نہ داغ کی شوخ اور عیاش طبعی کے، وہ عورت کو محبت ضرور کرتے ہیں، لیکن اس کی پوجا نہیں کرتے، ان کے افسانوں میں عورت ایک نئی روپ میں جلوہ گر ہوتی ہیں، عورت ان کے ہاں عیاشی اور گناہ کا مظہر نہیں بلکہ لطافت اور تازگی کے صحت مند تصور کی علامت ہے۔ خیالستان میں اس تصور سے متعلق ایسے بیانات ملتے ہیں:

''اگر نازک انگلیاں نہ ہوتیں، تو یاقوتوں سے اور پیاری گوری گردنیں نہ ہوں تو موتیوں کے وجود سے کیا فائدہ؟۔ عورت ایک بیل ہے جو خشک درخت کے گرد لپٹ کر اسے تازگی، اسے زینت بخش دیتی ہے، وہ ایک دھونی ہے کہ محبت کی لپیٹ سے مرد کو گھیر لیتی ہے، عورت اس سراب کی مانند ہے، کہ ڈھونڈو مگر نہیں ملتا، دکھائی دیتا معلوم ہوتا ہے مگر ہاتھ نہیں آتا''(4)۔

یلدرم عورت کو معاشرے میں مرد کے مساوی درجہ اور برابر کی آزادی دینے اور زندگی کے ہر موڑ پر اور ہر معاملہ میں اسے برابر کا ذمہ دار اور شریک کرنے اور رکھنے کے قائل ہیں، ''چڑیا چڑے کی کہانی'' میں لکھتے ہیں:

''میں ہر وقت اپنے چڑے کے ساتھ ہوں، یہاں تک کہ تدارک معیشت میں بھی برابر کی شریک ہوں، میں چڑے کو فخر و تفوق کا موقع ہی نہیں دیتی''(5)۔

اور ان کے علاوہ ''خارستان وگلستان ''میں عورت اور مرد کے فطری جذبات کو بڑے دلکش پس منظر میں پیش کیا گیا ہے، یہ پس منظر اس قدر رومانی ہے کہ ایک طرف چاند، ستارے، آسمان، دریا اور صحرا اپنے اپنے رومانی منصب کی تکمیل کرتے ہیں، جبکہ دوسری طرف مرد اور عورت کی جذباتی اور نفسیاتی کیفیتوں کی موجودگی، اس رومانی پس منظر اور شاعرانہ طرز بیان کو زندگی کے گہرے رنگ میں ڈبوتی اور فن اور حیات کی لطافتوں کو اس طرح یک جا کرتی ہے کہ ایک دوسرے کا حسن نکھرتا اور ابھرتا ہے، مختصراً یہ کہ سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں میں رومانیت اور حقیقت کا ایک خوبصورت اور دلفریب امتزاج ملتا ہے، ان کا طرز بیان بھی خالصتاً رومانی ہے اور ان کے کردار بھی، اسی بناء پر انہیں اردو میں رومانیت کا عظیم علمبردار کہا جاتا ہے۔

سجاد حیدر یلدرم کے رومانوی انداز کا اثر ان کے ہم عصروں پر بھی خوب پڑا، جن میں پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، منٹو، عصمت چغتائی اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ نے اپنے افسانوی موضوعات میں تبدیل کرکے حیدر یلدرم کے فن کو اپنا کر رومانوی انداز میں افسانے لکھے۔ جس پر حیدر یلدرم کے اثرات واضح طور پر حاوی ہے، یلدرم کے رومانوی طرز تحریر نے صرف اپنے ہم عصروں پر اثرات مرتب نہیں کئے بلکہ پاکستان ہو یا باہر ممالک ہو اس میں اسم میں جتنی بھی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اور ان سب زبانوں کے لکھاریوں نے اپنے افسانوی ادب میں اس موضوع کی کمی کو شدت سے محسوس کر کے اپنے افسانوں کے موضوع بنائے، اور اس میں بلوچستان کا پشتو ادب بھی پیچھے نہیں رہا، پشتون لکھاریوں نے بھی اپنے افسانوں میں ''رومانی ''موضوع کی کمی اپنے افسانوں میں محسوس کیا اور یلدرم کے افسانوں کے زیر اثر اپنے افسانوں میں اس موضوع پر ترجیح دے کر اس ضمن میں بہترین اور شاہکار افسانے تخلیق کئے۔

اس سلسلے میں لکھے جانے والے افسانوں میں حاجی مشوانی کا ''د محبوب پہ یاد کی'' اسماعیل شاہ کا ''سرہ بنگڑی'' سید عابد شاہ عابد کا ''د مینې تور'' فاروق سرور کا ''تندہ'' مرزاخان پیپسی کا ''د محبت وژمہ کرغنہ ''گوگوش'' د غرہ لمن'' اور ''شوگیرے'' اور در محمد کاسی کا ''ستی'' اس موضوع کی بہترین مثالیں ہیں، جس پر سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں کے رومانوی اثرات واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں، ان اثرات کے نتیجے میں ان افسانہ نگاروں کے قلم سے ایسے شاہکار افسانے تخلیق ہوئے جو فنی اور موضوعاتی حوالے

سے یلدرم کے افسانوں سے مطابقت رکھتے ہیں، بحثیت مجموعی ان افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں رومان اور محبت کے جذبے سے دوچار ان عورتوں کو معاشرے میں ان کا مقام دلانے کی سخت کوشش کی ہے۔ عشق اور عورت کو ان افسانہ نگاروں نے حاصل زندگی اور خوشگوار ماحول کا آئینہ قرار دیا ہے۔ اور ساتھ ساتھ ان ادیبوں نے ان افسانوں میں محبوب سے بچھڑے محبت کی کیفیت پر بھی روشنی ڈالی ہے، اور افسانہ "د محبوب پہ یاد کی" میں مصنف نے ایسے ہی محبت کی کہانی بیان کی ہے جو ہر وقت اپنی معشوقہ کے خیالوں میں کھویا رہتا ہے۔ محبوبہ کی یاد میں کھو کر وہ اتنا اسودہ حال بن جاتا ہے، کہ اسے اس کی محبوبہ جنت کی حوروں سے بھی زیادہ خوبصورت اور پُر کشش دکھائی دیتی ہے، لیکن جب ان کے خیالات کا سلسلہ ختم ہوتا ہے، تو اچانک ان کی خواہشات اور مسکراہٹ ان سے کوسوں دور چلی جاتی ہے، اور محبوب کی جدائی کا سوچ کر ان کے منہ سے چیخیں نکلنے لگتی ہے، افسانہ نگار نے اس افسانے میں خوبصورت تشبیہات کا استعمال کرکے افسانے کو چار چاند لگائے ہیں، جس کی وجہ سے پڑھنے والے کا دل بار بار پڑھنے کو کرتا ہے، خوبصورت تشبیہات اور خیالات کے بدولت اس افسانے پر یلدرم کے "سودائے سنگین" کے اثرات پائے جاتے ہیں۔

ان کے علاوہ ان افسانہ نگاروں نے ان افسانوں میں محبت کے حوالے سے ایک عورت کی شدید جذبات کو بھی دکھایا ہے، جو اپنے محبوب سے شدید محبت کی وجہ سے اس کے ہر ظلم و ستم کو خوش اسلوبی سے قبول کرتی ہے۔ اور محبت کی انتہا یہاں تک ہوتی ہے کہ اسے ہر شخص میں اپنا محبوب دکھائی دیتا ہے۔ افسانہ "تندہ" میں فاروق سرور نے ایسے ہے، رومانی کہانی بیان کی ہے، جس میں ایک لڑکی اپنے گھر کے نوکر "لالو" سے محبت کے جذبات رکھتی ہے، جس کی وجہ سے "لالو" اس کو روز مارتا ہے، اور آخر "لالو" "زرغونہ" کی سرکش محبت سے ڈر کر بھاگ جاتا ہے، اور پھر زرغونہ کی شادی ایک بوڑھے شخص سے ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے وہ ہر روز اس کے ظلم کا شکار ہوتی ہے، بوڑھا آدمی زرغونہ کو روز مارتا پیٹتا ہے، اور زرغونہ لالو کی محبت میں اتنی کوئی رہتی ہے کہ اپنے شوہر کے مار پیٹھ پہ اسے دکھ نہیں خوشی محسوس کرتی ہے، وہ سوچتی رہتی ہے جیسے یہ ظلم لالو ان پہ کر رہا ہو، رومانوی موضوع پر بنی یہ خوبصورت افسانہ ایک عاشق کا اپنے محبوب کے ہر انداز اور عادات سے شدید محبت کرتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ اور ہر شخص میں اپنے محبوب کا عکس دیکھتا ہے، فاروق سرور کے افسانوں پر بحث کرتے ہوئے سید لیاقت تابان یوں فرماتے ہیں:

"فاروق سرور کی کہانیوں کو بار بار پڑھنے کو دل چاہتا ہے اور ہر دفعہ اس کے افسانوں میں نئ لذت محسوس ہوتی ہے، یہ اس کا کمال ہے، اس وقت انکے افسانوں کا مطلب تمام جنوبی پشتونخوا کے افسانہ نگاروں پر ہے اور ہر افسانہ نگار کی یہ خواہش ہے کہ وہ فاروق سرور سے افسانوں کے سلسلے میں رہنمائی حاصل کریں"(6)۔

بلوچستان کے پشتو رومانی افسانوں میں ان افسانہ نگاروں نے ایسے رومانوی موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے جس پر ان سے پہلے عالمی اردو افسانہ نگاروں نے اٹھایا تھا، وہی روایتی اور پرانی کہانیاں ان افسانوں کی زینت بنی ہیں، جن میں مرزا خان پیپسی کا "د محبت وژمہ" "کرغنہ" "گو گو شش" اور "د غرہ لمن" اس پرانی اور روایتی رومانوی کہانیوں کی بہترین مثال ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ مرزا خان پیپسی نے اس روایتی رومانوی موضوع سے ہٹ کر ایسا رومانوی موضوع پر بھی قلم اٹھایا ہے۔

آنسوں سے تر چہرے کو ہمیشہ کی نیند سلا دیتی ہے، جس طرح یلدرم نے اپنے رومانوی افسانوں میں "محبوب" اور "معشوقہ" کے ایک ساتھ جینے کے خواب دکھائے ہیں، دوسری طرف معاشرے کے ان پر ناروا اور نازیبا سلوک کو بھی اپنے افسانوں میں دکھانے کی کوشش کی ہے، جس کے اثرات بلوچستان کے پشتون افسانہ نگاروں نے خوش اسلوبی سے قبول کر کے اپنے معاشرے میں خاص کر عورتوں کو ان کے "رومانوی" حقوق سے جو معاشرے نے محروم رکھا ہے اور ظلم اس سلسلے میں ان عورتوں پر ہو رہا ہے، ان معتبر ادیبوں نے اس ظلم سے پردہ اٹھا کر اس کو بے نقاب کرنے کی سخت سعی کی۔ اور کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ اور ان افسانوں میں رومانوی رجحان کے ساتھ ساتھ اصلاحی رجحان بھی غالب ہے۔

رومانیت کا اثر کچھ عرصے تک عالمی افسانہ نگاروں کے فن پر حاوی رہا، پھر اس کے تھوڑے عرصے بعد ان افسانہ نگاروں نے "رومانیت" سے ہٹ کر حقیقت نگاری کی طرف رجحان کیا، کیونکہ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ معاشرے میں ایسے فرسودہ رسومات نے جنم لئے، جس سے معاشرہ بگاڑ کا سبب بن رہا تھا، خاص طور پر کم عمر بچیوں کی بوڑھوں سے شادی جہیز کی لالچ میں۔ جو پوری تباہی کا باعث بن رہا تھا، اس غلط رسم کی تباہ کاری سے سب واقف بھی تھے، لیکن کسی نے اس کے خلاف آواز نہیں آٹھائی۔ بے حس لوگوں کی طرح اس آگ میں اپنی بہنوں اور بیٹوں کو دھکیلتے جا رہے تھے، اس موضوع پر سب سے پہلے ان عالمی ادیبوں نے قلم اٹھایا، کیونکہ ادیب حساس ہوتے ہیں، معاشرے میں اس ظلم کو

برداشت کرنے کی ان میں طاقت نہیں ہوتی، اسی لئے اس ظلم سے اپنے قلم کے ذریعے پردہ ہٹا کر خوبصورت افسانے تحریر کئے، ان افسانہ نگاروں میں سب سے پہلے پریم چند نے اس موضوع پر خوبصورت افسانے ''نیاہ بیاہ'' اور ''نئی بیوی'' میں پریم چند نے ایسے ہی ہوس پرست مردوں کی کہانی بیان کی ہے، جو خود پینتالیس سال کے ہوکر بھی جوانی کے ولولوں اور مسرتوں سے بے قرار ہیں اور دولت کا لالچ دے کر زندگیاں بسانے کی کوشش کرتے ہیں، کیونکہ ان دولت مند لوگوں کو یہ گمان رہتا ہے کہ محبت دولت سے خریدی جاسکتی ہے، اس افسانہ میں ''لالہ'' نے بھی ایسا ہی کیا تھا، آشا دیوی'' کے باپ کو پیسوں کا لالچ دے کر ''آشادیوں'' سے شادی کی، جو عمر میں ان سے تقریباً بیس یا پچیس سال چھوٹی ہوتی ہے، ''لالہ'' کا گمان تھا کہ محبت دولت سے خریدی جاسکتی ہے وہ آشادیوی کو ہر طرح سے بھانے کی کوشش کرتے ہے۔ لیکن آ شا ان دلچسپیوں سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوتی۔ لیکن آشا اپنے دولت مندھر شوہر کے بجائے ان کے نوکر ''جنگل'' کی طرف زیادہ مائل ہوتی ہے ڈاکٹر مسعود حسین ''نئی بیوی'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''نئی بیوی میں پریم چند نے ایک نوجوان عورت کی ایک مال دار بوڑھے کھوسٹ سے شادی کا جو انجام دیکھا ہے وہ حقیقت نگاری کا ایک جنکاہ واقعہ ہے اس سوال کا جواب کہ محبت دولت سے خریدی جاسکتی ہے پریم چند ہمیشہ نفی ہی میں دیتے ہیں لیکن شادی کے بعد یہ انجام دیکھانا کہ نئی بیوی اپنے معمر شوہر سے زیادہ نوجوان دیہاتی ملازم کی طرف مائل ہے ان کے دھرم پتنی والے باب اخلاق میں ایک دل دہلا دینے والا واقعہ ہوتا ہے''(7)۔

یہ افسانہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ان بیہودہ رسم ورواج سے نہ صرف عورت بد اخلاقی کی طرف راغب ہوتی ہے بلکہ مرد اس کا کس طرح سے جائز وناجائز استحصال کرنا روا سمجھتا ہے، شادی بیاہ کے ان خطرناک رسموں میں جہیز کی لعنت سب سے بڑی لعنت ہے، لڑکی کتنی ہی تعلیم یافتہ، خوب صورت یا سلیقہ مند کیوں نہ ہو اگر اس کے والدین مناسب ترین جہیز دینے کے لائق نہیں تو ایسی لڑکیوں کو لامحالہ بد کرداروں اور نااہلوں اور بد خلاقوں کو اپنانا پڑتا ہے، جس سے دو زندگیوں کے بیچ ایک گہری اور لمبی خلیج حائل ہو جاتی ہے۔ اور جس کا نتیجہ آخر کار لڑکی کو ہی بھگتنا پڑتا ہے، یہی برائی پریم چند کے زمانے میں بھی تھی، اور آج بھی موجود ہے، اگرچہ سماج کے مصلحین نے اس کی کھل کر مخالفت کی، لیکن پھر بھی یہ رواج قائم رہا ہے، پریم چند کی نظروں سے ایسے لوگ بچ نہیں سکے جو اس بے ہودہ رسم و رواج کو قائم رکھے ہوئے تھے، اور اپنے اس افسانے کے ذریعے کھل کر اس کی مخالفت کی، پریم چند صرف جہیز کے ہی مخالف

نہیں تھے بلکہ شادی بیاہ کے نام پر بے جا اور بے ہودہ رسم و رواج کے بھی سخت مخالف تھے، خصوصاً ایسی رسمیں جو یک طرفہ ہوں اور اقتصادی طور پر انسان کو کمزور کرتی ہوں۔

ایسے فرسودہ رسم و رواج جس سے معاشرہ تباہی یا بگاڑ کا باعث بن رہا ہو، چاہئے وہ جہیز ہو یا ولور اس کو ہر جگہ اور ہر دور کے افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوی موضوعات میں وسعت دے کر اس رسم سے بغاوت کی ہیں، اور بلوچستان کے لکھاریوں نے بھی چاہئے وہ اردو لکھنے والا ہو، پشتو لکھنے والا ہو یا بلوچی لکھنے والا ہو، ان سب نے اس فرسودہ رسم کی مذمت اپنے افسانوں کے ذریعے کی ہیں، کیونکہ "جہیز" اور "ولور" ایک ہی چیز ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ جہیز کی رقم کی ادائیگی میں دلہن کے باپ کو خوار اور ذلیل ہونا پڑتا ہے، جبکہ "ولور" کی ادائیگی میں دلہے کے باپ کو اصطلاحی معنوں میں یہ دونوں لفظ اکیلا دوسرے کے مترادف ہے، جس کا مطلب عورت کی قیمت ہوتی ہے، چونکہ پشتون معاشرے میں بغیر ولور کے عورت کا ملنا ناممکن ہوتا ہے، اور خاص کر قبائلی علاقوں میں ولور کی رقم اتنی زیادہ ہوتی ہے جس کو ادا کرنے میں کئی سال گزر جاتے ہیں، جس کے منفی اثرات آخر یہ نکلتے ہیں کہ لڑکی کی جوانی پھر ڈھلنے لگتی ہے، اپنے باپ کے گھروں میں بیٹھی ہوتی ہے، جس کی بدولت والدین مصیبتوں میں گرے ہوتے ہیں، ان منفی اثرات کو دیکھ کر لوگوں میں شعور بیدار ہوا اور اس فرسودہ رسم کے خلاف کھل کر آواز بلند کیا، اور قلم کے ذریعے بھی اس کی شدید مذمت کی۔

بلوچستان کے پشتو افسانے میں اس رسم کے خلاف آواز ابوالخیر زلاند نے افسانہ "ولور مات سو" فاروق شاہ اسماعیلزئی نے افسانہ "ولور" اور فاروق سرور نے "چار گل" "مالیار" اور "وادہ" کے ذریعے اس رسم سے خوب پردہ ہٹا کر اس رسم کی کھل کر مذمت کی۔ ان افسانہ نگاروں نے اپنے ان افسانوں میں پشتون کلچر کے اس رسم کی منفی پہلو کو بطور خاص پیش کیا ہے، جس کا خمیازہ عورتوں کی ہی بھگتنا پڑتا ہے، کیونکہ اسی ولور کی لالچ میں بہت سے والدین اپنے خوبصورت اور کم عمر بچیوں کو آگ میں جھونک دیتے ہیں، اس غلط رسم نے لاکھوں لڑکیوں کی زندگیاں برباد کیں، اور انہیں خودکشی کرنے پر مجبور کر دیا، اور کچھ کو گھربار چھوڑنے پر مجبور کیا۔

مجموعی طور پر یہ افسانے اس فرسودہ رسم کے خلاف ایک مضبوط کڑی ہے، اگرچہ یہ رسم کھلی طور پر تو نہیں لیکن جزوی طور پر ضرور ختم ہوا ہے، جس طرح پریم چند نے اس دور میں اپنے معاشرے کی اس غلیظ رسم کو افسانہ "نئی بیوی" کی "آشادیوں" کا اپنے بوڑھے شوہر کو چھوڑ کر اپنے نوکر "جگل" کے

ساتھ غلط تعلقات کے ذریعے سماج پر طنز کیا ہے۔ بلکل اسی طرح فاروق سرور نے افسانہ ''مالیار'' میں ''نازو'' کی اچانک موت کو سامنے رکھ کر اس فرسودہ رسم کا پردہ چاک کیا ہے۔ کیونکہ پشتون معاشرے میں یہ رسم ابھی بھی دیہی علاقوں میں عروج پر ہے، اسی لئے بلوچستان کے پشتون افسانہ نگاروں نے اس رسم سے جنم لینے والی برائیوں کو بار بار اور مختلف انداز میں اجاگر کیا ہے، اور اس رسم سے جنم لینے والے بے شمار مسائل کو کھل کر بیان کیا ہے، جس طرح عالمی اردو افسانہ نگار پریم چند نے کیا تھا، پشتو کے یہ افسانہ صرف موضوع کے حوالے سے پریم چند کے افسانہ سے مطابقت نہیں رکھے، بلکہ ان افسانوں کے کردار وں اور خوبصورت پلاٹ میں بھی مماثلت ہے، کیونکہ پریم چند اس رسم کی حقیقت سے واقف تھے اور وہ کہتے ہین کہ:

"جب تک سماج کا یہ نظام قائم ہے اور لڑکی کا بلوغ کے بعد کنواری رہنا انگشت نمائی کا باعث ہے اس وقت تک یہ رسم فنا نیں ہوسکتی، دو چار افراد بھلے ہی ایسے بیدار مغز نکل آئیں جو جہیز لینے سے انکار کریں لیکن اس کا اثر عام حالات پر بہت کم ہوتا ہے اور برائی بدستور قائم رہتی ہے''(8)۔

اسی طرح ایک اور فرسودہ روایت جو ہر دور میں ہر جگہ اور ہر سماج میں عروج پر رہا ہے، وہ ہے توہم پرستی، جس نے انسانی معاشرے پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں، ابتدائی انسان سے لے کر جدید انسانی معاشروں میں بھی توہمات کر کثرت پائی جاتی ہیں، دراصل توہم پرستی مختلف قسم کے اوہام ہوتے ہیں، جن میں چیزوں کو یا انسانوں کو مختلف واقعات کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے، جن میں لوگوں کو منحوس قرار دینا، کسی چیز کو بدشگونی کی علامت قرار دینا، جادوٹونے اور بندش پر یقین رکھنا شامل ہیں، گھروں میں ناچاقی اس کی وجہ سے پھیلی ہوئی ہے، خوشحال گھروں میں ماتم کا عروج بھی اسی کی بدولت سے ہے۔

اس فرسودہ روایت پر بھی ادیبوں نے اپنے الفاظ اور تحریر کے ذریعے سے وار کیا ہیں جن میں عالمی ادب کے نامور افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی نے افسانہ ''رحمان کے جوتے'' لکھ کر اس روایت کی اپنے افسانے کے ذریعے بھرپور مذمت کی ہے، بظاہر تو رحمٰن کے جوتے ایک معمر آدمی کی بے کسی اور افلاس کی انوکھی کہانی ہے، لیکن گہری فنکارانہ بصیرت سے ضبط تحریر کیا گیا، افسانہ کا پہلا تاثر تو یہی ہے کہ جوتے پر جوتا چڑھنے کے توہم سے ایک بے مثال افسانہ کی تعمیر کی گئی ہے، رحمان کے ساتھ اکثر ایسا ہوا ہے کہ جوتے پر جوتا چڑھتا ہے تو اسے سفر درپیش آتا ہے، ایک بار اس کا جوتا جوتے پر چڑھا تو اسے ضلع کچہری جانا

پڑا تھا، سو اتفاق سے رحمان کی نگاہ اس بار بھی اپنے جوتوں پر جا پڑی جو اس نے جلدی سے کھاٹ کے نیچے اتار دیئے تھے۔ رحمان نے ہنستے ہوئے کہا:

''آج پھر میرا جو تا جوتے پر چڑھ رہا ہے، جیناں کی ماں۔۔۔ اللہ جانے میں نے کون سے سفر پر جانا ہے، جینا کو ملنے جانا ہے، اور کہاں جانا ہے؟ بڑھیا بولی، یوں ہی تو نہیں تیرے گوڈر دھورہی ہوں بڈھے''(9)۔

اور رحمان اپنی بیٹی سے ملنے انبالہ کے سفر پر روانہ ہوتا ہے، یہ سفر رحمان کی زندگی کا آخر سفر ثابت ہوتا ہے، جوتے پر چڑھا ہوا جوتا جو سفر کا شگون ہے، یکایک ایک منحوس علامت بن جاتا ہے، یعنی موت کی علامت۔ یہ موت کرنال کے ریلوے اسپتال میں واقع ہوتی ہے، اور جب ہسپتال میں ڈاکٹر اور نرس اس کے سرہانے کھڑے ہوتے ہیں تو اسے قے کی حاجت محسوس ہوتی ہے، نرس فوراً چلمچی بیڈ کے نیچے سرکا دیتی ہے، رحمان جب قے کرنے کیلئے جھکتا ہے تو اس کی نظر پلنگ کے نیچے اپنے جوتوں پر پڑتی ہے، پھر ایک جوتا دوسرے پر چڑھ گیا تھا، رحمان ایک میلی سی سکڑی ہوئی ہنسی ہنسا اور بولا، ڈاکٹر جی! مجھے سفر پر جانا ہے، آپ دیکھتے ہیں میرا جوتا جوتے پر کیسے چڑھ رہا ہے، ڈاکٹر جواباً مسکرا کر کہتا ہے ہاں بابا تو نے بڑے لمبے سفر پر جانا ہے اور رحمان ایک لمبے سفر پر روانہ ہو جاتا ہے۔

بیدی نے اپنے اس افسانے میں نہایت خوبصورتی کیساتھ اس فرسودہ عقیدے کو سرعام دکھانے کی کوشش کرکے اس کی سخت مذمت کی ہے، جو عقیدہ لوگوں کا جس چیز کے بارے میں جیسا ہوتا تھا، اس کے ساتھ پھر ہوئی ہوتا تھا، جیسے رحمان کے ساتھ ہوا، اس قسم کے توہمات بیدی کے زمانے میں بھی عروج پر تھے اور آج کے دور میں بھی جوتے کا جوتے پر چڑھنا دو معنوں میں آتا ہے، ایک علامت سفر کا اور دوسرا موت کا، جوتے سفر اور آخری سفر دونوں کی پیش بنی کرتے ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے، یہ توہم پرستی کے علاوہ کچھ بھی نہیں، بیدی نے لوگوں کے اس عقیدے کو اپنے افسانہ کے ذریعے بے نقاب کیا ہے، جو ایک بہترین اور اصلاحی کوشش ہے۔

بلوچستان میں پشتو کے افسانہ نگار فاروق سرور نے بیدی کے اس افسانے کے زیر اثر افسانہ ''مجرم'' لکھ بلوچستان میں پائے جانے والے ایسے فرسودہ عقائد کو منظر عام پر لانے کی بھرپور کوشش کی ہے، بیدی نے اپنے افسانے میں جوتے پر جوتے کا چڑھنا موت کی علامت قرار دیا ہے، جبکہ فاروق سرور نے اپنے معاشرے میں رائج عقیدہ قبرستان میں کوؤں کے آنے پر موت کی علامت ٹھہرایا ہے، افسانہ

''مجرم'' میں مصنف نے ایک ایسے لڑکی کی کہانی بیان کی ہے جس کا گھر قبرستان کے قریب ہوتا ہے، اور اس کا عقیدہ ہوتا ہے کہ قبرستان میں جب کوے آتے ہیں تو یہ مردوں کو نئے مہمان آنے کی خبر دیتا ہے، وہ بچپن میں ایک لڑکے سے محبت کرتی ہے اور وہ لڑکا ایک مجرم ہوتا ہے، وہ پولیس سے چھپ کر ہر روز قبرستان میں پناہ لیتا تھا، جب وہ قبرستان میں کوؤں کو دیکھتی ہے اور اسے وہم ہوتا ہے کہ اس کے ''لال'' کو کچھ ہوا تو نہیں، اسے وسوسہ ہوتا ہے کہ اس بار مرنے کی باری کس کی ہے۔ اتنے میں اس کا باپ گھر آتا ہے اور اسے بتاتا ہے کہ لال کو پولیس نے گولی مار دی ہے، تو پاگل ہو جاتی ہے، کوؤں کو پتھروں سے مارتی ہے کہ تو ہے قاتل، تو نے میرے لال کو مارا ہے، اب میں تمہارا وجود مٹادونگی، پھر موت کا نام ونشان تک نہیں ہوگا، پھر کوئی اپنے لال کے لئے نہیں روئے گا۔

فاروق سرور کا یہ افسانہ بلوچستان میں رائج اس فرسودہ عقائد کی بہترین عکاسی کر رہا ہے، جو جہالت کے پیش نظر بلوچستان کے لوگ بھی اس قسم کے عقائد میں مبتلا ہے، جو اصل میں کفر کے زمرے میں آتے ہیں، بہت سے لوگ اس طرح کے غلط عقائد کے پیروکار ہے اور افسانہ نگار نے اپنے معاشرے میں اپنے لوگوں کی اسی برائی کا ذکر اپنے اس افسانے میں کیا ہے، جیسے عالمی افسانہ نگاروں میں راجندر سنگھ بیدی نے کیا تھا۔

ثقافتی یا فرسودہ عقائد و رسم و رواج سے ہٹ کر افسانہ نگاروں نے اس موضوع کو بھی زیر قلم لانے کی بھرپور کوشش کی ہے، جس سے ہمارے معاشرے کی خواتین متاثر ہو رہی ہے۔ یعنی طوائف جو اس معاشرے میں عورت کا دوسرا نام ہے، اس معاشرے میں ایک اہم ترین مسئلہ رہی ہے۔ اس برائی کو پناہ دینے میں بیہودہ اور غیر ضروری رسم و رواج کا سب سے بڑا ہاتھ ہے، حقیقتاً معاشرہ میں جس قدر بد اخلاقیاں پروان چڑھتی ہیں، طوائف ہی کو ان کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے، طوائف ہی تمام گناہوں کی جڑ سمجھی جاتی ہے، اگر یہ برائی معاشرے سے دور ہو جائے تو تقریباً تین چوتھائی برائیاں سماج سے دور ہو جائیں گی، لیکن کبھی کسی نے یہ غور نہیں کیا کہ آخر ایک عورت اپنی قیمتی اثاثے کا قربانی بالآخر اتنی آسانی سے کیوں دیتی ہے، آخر وہ کیا وجوہات ہیں جس کی وجہ سے وہ یہ سب کرنے پر مجبور ہوتی ہے، اس معاشرہ کا دوہرا معیار تو دیکھیں کہ وہ عورت جس کا دنیا میں کوئی پرسان حال نہیں اور وہ پیٹ کا دوزخ بھرنے کیلئے اپنا جسم بیچے وہ پھر طوائف اور فاحشہ، جبکہ دوسری طرف وہ عورت جو شادی شدہ ہونے کے باوجود کسی غیر مرد کی باہوں میں جھول جائے وہ اس معاشرے کیلئے کیا ہے؟۔

یہ معاشرہ اسے طوائف کیوں نہیں کہتا؟، اس کا بائیکاٹ کیوں نہیں کیا جاتا؟، کیا صرف اس لئے کہ اس کے نام کے ساتھ ایک مرد کا نام جڑا ہے، اس لئے کہ وہ اس دنیا میں اکیلی ہیں۔

آج تک دنیا میں کبھی کسی مذہب یا کسی سوشل ادارے نے اس مسئلے پر نقطہ نگاہ نہیں ڈالی، کسی نے اس مسئلے کو اجاگر کرنے کی کوشش نہیں کی، کہ آخر عورت اس کام کی طرف کیوں راغب ہو جاتی ہے، ایسے کیا وجوہات یا مجبوری ہو سکتی ہے؟، بس یہ لوگ صرف ایک کام بہت ایمانداری سے کرتے ہیں اور ابھی تک کر رہے ہیں، اس عورت کو جس کا دوسرا نام "طوائف" ہے، اس کو اسی معاشرے میں انہی لوگوں نے اس کو جینے کے حق سے محروم رکھا ہے، جو اپنی تسکین پانے کیلیئے رات کو ان کے کوٹھیوں کا چکر لگاتے ہیں، اور بعد میں تذلیل بھی خود کرتے ہیں، کہ معاشرے میں ماں، بہنیں اور بیٹیاں رہتی ہیں، اس معاشرے میں طوائف کا رہنا ہم کسی بھی صورت برداشت نہیں کر سکتے۔

اس موضوع پر عالمی اردو ادیبوں نے اپنے قلم کے زور سے اس مسئلے کی دھجیاں اپنے شاہکار افسانوں کے ذریعے اڑائی ہیں، کیونکہ ادیب حساس ہوتے ہیں، دکھ، درد کو صرف یہی لوگ بہتر سمجھتے ہیں، تقریباً کم و بیش افسانہ نگاروں نے اس موضوع کو چیڑا ہے، لیکن سعادت حسن منٹو نے صرف اس موضوع پر لکھا نہیں بلکہ ان کے دکھ درد کو قریب سے محسوس کر کے ان کے زبانی بیان کیا ہے، اور اسی کی خاطر عدالتوں کے چکر بھی لگا چکے ہیں۔

طوائفوں سے متعلق مرزا ہادی رسوا بہت پہلے "امراؤ جان ادا" لکھ چکے ہیں، اس ناول میں بھی طوائفوں کے مسائل کو دکھایا گیا ہے، کہ ایک لڑکی طوائف بن جانے کے بعد کہیں کی نہیں رہ جاتی ہے، چاہے وہ خوبیاں رکھتی ہو یا نہیں، جبکہ اس میں اس کا کوئی قصور بھی نہیں، وہ مجبور ہے مظلوم ہے، تاہم رسوا اور منٹو میں فرق یہ ہے کہ منٹو نے کوئی شے پردے میں نہیں رکھی جبکہ رسوا نے ہر شے پردے میں رکھی، بیدی نے بھی اپنے افسانوں میں عورت کی مجبوری اور بے بسی کو ہی دکھایا ہے، لیکن بیدی کے یہاں عورت ماں، بہن، بیٹی اور بیوی ہے، ان کا رشتہ پاک ہے، منٹو نے سب سے منفرد اور جداگانہ طرز تحریر اختیار کیا، ان کے ایسے افسانوں میں عورت صرف عورت ہے۔

منٹو کے اس طرح کے افسانوں میں "ٹھنڈا گوشت" "موچنا" "عورت ذات" "کالی شلوار" "سو کینڈل پاور کا بلب" "سراج" "برمی لڑکی" "سرکنڈوں کے پیچھے" "شانتی" "محمودہ" "ممی" "بو" "ہتک" "جانکی" "سڑک کے کنارے" "پشاور سے لاہور تک" "حامد کا بچہ" اور "بری عورت" ایسی کہانیوں پر

مشتمل افسانے ہیں، جس کا مرکزی کردار تو طوائف ہے، لیکن ان افسانوں میں عورت کی مجبوری اور بے بسی کو دکھایا گیا ہے، اگرچہ وہ غلط دھندہ کر رہی ہیں، یہ طوائفین ضرور ہیں جن کو سماج بری عورتیں کہتا ہے، برا سمجھتا ہے، لیکن ان عورتوں کے بھی دل ہیں وہ بھی انسان ہیں، کوئی بھی غلط راہ کا انتخاب اپنی پسند سے نہیں کرتا، حالات اور معاشرہ مجبور کر دیتا ہے، لیکن ہر کسی نے الزام لگایا ہے اور ہر کوئی سمجھتا ہے کہ سعادت حسن منٹو اپنے افسانوں میں عورت کے کپڑے اتارتا ہے، مگر سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے ان ہی عورتوں کے بارے میں لکھا ہے، جن کے کپڑے حالات اور ہمارے معاشرے نے اتارے ہیں، "ہتک" کی سوگندھی ہو، "کھول دو" کی سکینہ، "کالی شلوار" کی سلطانہ، یا پھر "ٹھنڈا گوشت" افسانے کی کلونت کور ہو، یہ منٹو کے وہ کردار ہیں جو حالات کے مارے ہوئے ہیں، اگر انہوں نے ان تمام لوگوں کو اپنا کردار بنایا ہے تو کیا انہوں نے کوئی گناہ کیا ہے؟، انہوں نے وہ لکھا ہے جو معاشرے نے انہیں دکھایا ہے، ان کے پاس خوبصورت الفاظ نہیں ہیں، نہ ہی ایسی تشبیہات اور استعارے جنہیں پڑھ کر ہم کھو سے جائیں، وہ ایسے افسانوں میں خوبصورت الفاظ کہاں سے لاتے جب ان کے کرداروں کی زندگی ہی زہر تھی۔

حوالہ جات

(1) طاہرہ اقبال، منٹو کا اسلوب (افسانوں کے حوالے سے) ص۴۸۔

(2) سید وقار عظیم، پروفیسر، داستان سے افسانے تک، ص ۲۳۴۔

(3) سلیمان ندوی سید، سجاد حیدر یلدرم، ص ۶۸۔

(4) سجاد حیدر یلدرم، خیالستان، ص ۲۶۷۔

(5) ایضاً، ص ۲۰۸۔

(6) سید لیاقت تابان، رسالہ تماس، ص ۳۵۔

(7) مسعود حسین خان، ڈاکٹر، پریم چند کے افسانہ نگاری کے دور، ص ۴۳۱۔

(8) واجد قریشی ڈاکٹر، پریم چند کے افسانوں میں حقیقت کا عمل، ص ۱۱۵۔

(9) راجندر سنگھ بیدی، رحمان کے جوتے، ص ۳